’امت‘و’قوم‘ کامفہوم ودائرہ کار(ایک تحقیقی وتقابلی جائزہ)

A.Difference between the scope of Ummah and Nation comparative research overview

ڈاکٹر محمد عمران [1]

ABSTRACT

"Umat-o-Qaum"are synonyms. Both means 'group' or 'class'. Literally, the word Qaum means the group or class of those people who has the similarity in cast, language and time . And the meaning of 'Umat' is class which is based on one belief. This word 'Umat' especially, is used for the Muslim's religiousness . It means all the Muslims of the world are just like one class. Literally, the word 'Qaum means such a group of people which came into being after passing longtime progressive steps. In its progressive process, there is a big part of Psychology, language, religion, cast, Economical and social similarity. if a group of people has few of them qualities, we can call that group a Qaum. Inspite of the similarity in all the above mentioned values, there must be the similarity of time in a Qaum. It means the people of one time would be called one Qaum but the word 'Umat' is free from this restriction also. Any person can be the member of Muslim Umat any time after accepting the Kalma Toheed but cannot be the member of a Qaum and get out of it atonce, for this, he has to pass through the long progressive process.

امت کامفہوم:

’’الامۃ‘‘ عربی زبان کالفظ ہے۔ یہ ام سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں ماں۔ یہ اسم مئونث شمار ہوتا ہے اسکی جمع ’امم‘ ہے۔’امۃ‘ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے فرد واحد جو جامع خیر ہو، امام، ایسی جماعت جس کی طرف کوئی رسول مبعوث ہوا ہو، ہر جاندار کی نسل، جنس، وہ شخص جو برسرحق اور دوسرے تمام ادیان کا مخالف ہو، زمانہ قامت، ماں، چہرہ، سرگرمی، اطاعت، عالم، امۃ الوجہ سے مراد چہرہ کے نقوش، امۃ الرجل سے مراد قوم، امۃ اللہ سے مراد مخلوق۔ صاحبِ لسان العرب کے مطابق و الأمة: القرن من الناس، یقال: قدمضت امم ای قرونٔ، و امة کل لنبی: من ارسل الیھم من کافر و مؤمن (ا) امت سے مراد ہے ایک زمانہ کے لوگ۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ امتیں فلاں ادوار کی۔ اور ہر نبی جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا چاہے وہ کافر ہوں یا مومن امت کہلاتے ہیں۔ لغات

[1] اسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

القرآن کے مطابق لفظ امت کے معنی ہیں جماعت، مدت، طریقہ، دین۔(۲) قاموس مترادفات میں امت کے معنی قوم، مت، جماعت، گروہ، پیروکار، ایک مذہب والے جبکہ اسکی جمع امم کے معنی ہیں امتیں، اقوام، ملل، جماعتیں، گروہ وغیرہ۔(۳) 'حسن اللغات' میں بھی تقریباً یہی معنی مذکور ہیں۔(۴) صاحب نور اللغات کے مطابق ''امت: مئونث گروہ جو کسی پیغمبر کا پیرو اور تابع ہو۔''(۵) 'المنجد' میں اسکے درج ذیل معنی کیے گئے ہیں: الامۃ: الطریقۃ، الامی: من لایعرف الکتابۃ والقراءۃ(۶) الامۃ: جماعت، الامی: ان پڑھ، الامیۃ: پڑھنا لکھنا نہ جاننے والے لوگ۔ جبکہ مصباح اللغات میں یہ مندرج ہیں: الامۃ: جماعت، لوگوں کا گروہ طریقہ وقت، قد و قامت(۷)

اصطلاحاً وہ جماعت جن کے مابین رشتہ دینی ہو یا وہ جغرافیائی اور عصری وحدت میں منسلک ہوں۔ دنیا میں نسلی، نسبی اور الوانی اختلافات کی بناء پر فخر و امتیازات عروج پر تھے۔ ایرانیوں کو اپنے گورے رنگ پر اتنا ناز تھا کہ حبشیوں اور ہندوؤں کو کوے کہا کرتے تھے۔ عربوں کو اپنی زبان کی ساخت اور مفہوم کی ادائی کی صلاحیت پر اتنا ناز تھا کہ اپنے سوا ساری دنیا کو گونگا سمجھتے تھے۔ اتنے میں یہ صدا بلند ہوئی یَا أَیُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاکُم۔۔۔ إِنَّ أَکْرَمَکُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتْقَاکُمْ (۸) ''اے انسانو! ہم تمہیں ایک مرد ایک عورت سے پیدا کرتے ہیں اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں محض اس لیے بانٹتے ہیں کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو ورنہ خدا کے نزدیک تم میں سب سے معزز تو وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار اور خدا ترس ہو۔'' لفظ امت کا بنیادی طور پر ایک ہی معنی نکلتا ہے اور وہ ہے جماعت۔ لیکن چونکہ جماعتیں بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں مثلاً انبیاء کا اتباع کرنے والوں کی جماعت، علماء کی جماعت، ان لوگوں کی جماعت جن کی طرف انبیاء مبعوث ہوئے، ہر جاندار کی نسل یا جنس وغیرہ۔ امام طبری کہتے ہیں کہ امت کی اصل لوگوں کی ایسی جماعت ہے جو ایک دین اور ایک ملت پر جمع ہو ان کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ امۃ اسم فاعل کے معنی میں ہے۔(۹) ابوجعفر طبری کا قول ہے کہ امت دین کے معنی میں بھی آتا ہے اسکی اصل یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو ایک دین پر ہوتے ہیں امت کہا جاتا ہے اس طور پر امت کو دین کا قائم مقام کر دیا گیا۔(۱۰) ابن قتیبہ لکھتے ہیں **والاصل انه یقال للقوم یجتمعون علی دین واحد: امة، فتقام الامة مقام الدین** (۱۱) قوم اصل میں ایک دین پر جمع ہونے والے لوگوں کے گروہ کو کہتے ہیں اور امت سے مراد جو ایک دین پر قائم ہوں۔

امۃ بمعنی فرد واحد جب وہ برسرحق اور دوسرے تمام ادیان کا مخالف ہو یا بےنظیر ہو یا خیر کا جامع ہو یا عالم ہو یا امام ہو۔ یہ تمام الفاظ مترادف ہیں جو ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں پیش کرتے ہیں۔ امۃ بےنظیر شخص کو بھی کہتے ہیں اور اسکا اطلاق ایسے شخص پر بھی ہوتا ہے جو خیر کا جامع ہو جیسے زید بن عمرو بن نفیل کے سلسلے میں وارد حدیث ہے **انه یبعث یوم القیامة امة واحدة**(۱۲) وہ قیامت کے دن ایک امت کی شکل میں اٹھائے جائیں گے۔ امۃ فرد واحد کے لئے کیسے استعمال ہونے لگا اس کی توجیہ صاحب لسان یہ پیش کرتے ہیں **و معنی الامة فی الفرد المنفرد الذی لا نظیر له ان قصده منفرد من قصد سائر الناس** (۱۳) چونکہ فرد واحد کا قصد (دین کے معاملے میں) عام لوگوں کے قصد سے مختلف ہوتا ہے اس لئے اسے امت کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فردِ واحد کو اس کے قصد یعنی ارادہ کی بناء پر امت کہا گیا ہے۔ اس کا مدعا و مقصد ایک پوری جماعت کے مقصد کے برابر یعنی قائم مقام ٹھہرا لہٰذا اسے یہ حق ہے کہ وہ اکیلا ہی امت کہلائے۔ یعنی اس اکیلے نے وہ کام کیا جو ایک پوری امت کے کرنے کا تھا۔ امام راغب

اصفہانی نے ابراھیم کان امۃ (۱۴) کی تفسیر میں لکھا ہے ای قائماًمقام جماعۃ فی عبادۃ اللہ(۱۵) اسکا مطلب ہے کہ فرد واحد اللہ کی عبادت میں جماعت کے قائم مقام ہے۔یعنی ایک فرد امت نہیں ہوتا بلکہ ایک پوری امت کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے امت کہلاتا ہے۔ابن قتیبہ نے لکھا ہے ای: اماماً یقتدی بہ الناس، و من اتبعہ امۃ، فسمی امۃ لانہ سنن الاجماع(۱۶)''امۃ'' امام اور معلم خیر کے معنی میں ہے فرد واحد اور اسکے متبعین ملکر ایک امت بنتے ہیں اس لئے اسے امت کہہ دیا گیا ہے کیونکہ وہ اجتماع کا سبب ہوتا ہے۔فردِ واحد پر لفظ 'امت' کے اطلاق کی چند صورتیں یہ ہیں جیسے ایک مقصد کی بناء پر، اپنے ایمان وعقیدہ یعنی توحید وحق پرستی کی بناء پر، کسی ایک جماعت کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے جیسے معلم یا امام، ایسا شخص جو ایک امت کی تشکیل وتکمیل کا ذریعہ وسبب بنے یا پھر ایسا آدمی جس کی ذات میں اتنی خوبیاں وبھلائیاں جمع ہوجائیں کہ عام حالات میں وہ ایک پوری امت میں ہوسکتی ہیں۔جب فردِ واحد میں ان میں سے کوئی ایک وصف پیدا ہوجائے تو وہ اکیلا ہی ایک کے قائم مقام ہوگا۔

امۃ بمعنی وقت زمانہ یا سال۔سالوں میں دن اور مہینے جمع ہونے کی وجہ سے امۃ زمانہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔امام طبری نے لکھا ہے **والاصل الامۃ ما قد بینا فیمامضی من کتابنا ھذا انھا الجماعۃ من الناس مجتمع علی مذھب و دین ثم تستعمل فی معان کثیرۃ ترجع الی معنی الأصل الذی ذکرت وانما قیل لسنین المصدودۃ والحین فی ھذا الموضع ونحوہ امۃ لان فیھاتکون الأمۃ وانما معنی الکلام**(۱۷)''امت سے مراد اصل میں انسانوں کی ایک جماعت ہے جو دین و مذہب کی بنیاد پر جمع ہوئے ہوں پھر یہ کثیر معنی میں استعمال ہونے لگا لیکن اسکے تمام معنی اسی اصل معنی کی طرف لوٹتے ہیں جو بیان ہوا۔اور بیشک زمانہ اور سال کو امۃ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں امت ہوتی ہے اس کلام کا یہی معنی ہے۔''امام طبری کی اس تحریر سے معلوم ہوا کہ امت کے اصل معنی (گروہ، جماعت) ہمیشہ برقرار رہتے ہیں ہاں استعمال کے لحاظ سے کہیں کچھ فرق آجاتا ہے جیسے زمانہ اور سال کے لئے اس کا استعمال۔یہاں بھی اصل میں مراد اس زمانہ یا سال میں پائی جانے والی جماعت ہے وہ جماعت جس پر امت کا اطلاق ہوتا ہے۔اس کی توجیہہ ابن قتیبہ سے ملتی ہے **کان الامۃ من الناس القرن ینقرضون فی حین**۔۔۔(۱۸)اس میں ایک امت (لوگوں کی جماعت) ہوتی ہے اس لئے امت کو زمانہ کا قائم مقام کردیا گیا۔

امت قرآن وحدیث کی روشنی میں:

لفظ امت قرآن کریم میں مختلف مقامات پر مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔گروہ یا جماعت کے معنوں میں یہ پچاس سے زائد مقامات پر آیا ہے۔بیشتر جگہوں پر اس لفظ کا استعمال مومنین کی جماعت کے لئے کیا گیا ہے۔چند مخصوص مقامات جیسے الاعراف ۳۸، الاحقاف ۱۸، العنکبوت ۱۸، حم السجدہ ۲۵ پر گروہ کفار، جھٹلانے والی امتوں اور گروہ خاسرین کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔اسکے علاوہ بعض مقامات پر اسکا استعمال عمومی نوعیت کا حامل ہے جہاں بغیر کسی استثناء کے مختلف امتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جیسے **:وَ قَطَّعْنَاھُمْ فِیْ الأَرْضِ أُمَماً مِّنْھُمْ۔۔۔۔۔۔۔ وَبَلَوْنَاھُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّیِّئَاتِ لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُونَ** (۱۹)''ہم نے دنیا میں

انکی مختلف جماعتیں کردیں ان میں نیک تھے اور بعض اور طرح کے تھے اور ہم ان کو خوشحالیوں میں بدحالیوں میں آزماتے رہے کہ شاید وہ باز آجائیں''

اس کے علاوہ درج ذیل آیات میں یہ لفظ عمومی انداز میں آیا ہے جیسے النساء ۴۱، الاعراف ۳۴،۴۴، یونس ۴۹، یونس ۴۷، الرعد ۳۰، الحجر ۵، النحل ۵۶، ۸۴، ۸۹، ۹۷، الحج ۳۴، ۶۷، المومنون ۴۳، ۴۴، القصص ۲۳، ۷۵، المومن ۵، الجاثیۃ ۲۸۔ از روئے قرآن پوری نوع انسانی دو گروہوں میں منقسم ہے ایک مومن اور دوسرا کافر: وَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَمِنۡکُم مُّؤۡمِنٌ (۲۰) ''اس نے تمہیں پیدا کیا سو تم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مومن'' اس آیت کے مطابق قرآن کریم نے لفظ 'امت' انسانوں کے دونوں گروہوں یعنی مسلمان اور کافر کیلئے استعمال کیا ہے۔ چونکہ امت کا اطلاق ایک عقیدہ اور ایک نظریہ پر متفق لوگوں کی جماعت پر ہوتا ہے لہٰذا کافر بھی ایک عقیدہ کفر پر متفق ہونے کی بناء پر ایک امت ہیں۔ احادیث سے بھی اس بات کی توثیق ہوتی ہے جیسے حدیث لا یتوارث اھل ملتین شتی'(۲۱) مختلف ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے میں 'ملتین' سے دو ملتیں مراد ہیں اسلام اور کفر۔ جہاں تک مومنین کا تعلق ہے اس گروہ کے لئے قرآن کریم میں بالتخصیص امت کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے إِنَّ هَٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمۡ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُونِ (۲۲) ''یہ تمہاری امت ہے جو درحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں پس تم میری ہی عبادت کرو۔'' حتیٰ کہ اس امت کا نام بھی شروع سے ایک ہی چلا آ رہا ہے هُوَ سَمَّاكُمُ الۡمُسۡلِمِينَ مِن قَبۡلُ وَفِي هَٰذَا (۲۳) اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اس سے پہلے بھی اور اب بھی یہی ہے۔

اس کو دوقومی نظریہ کہتے ہیں یعنی پوری نوع انسانی کے وہ تمام افراد جنہوں نے اسلام قبول کیا وہ ایک خاص گروہ ہیں جسے قرآن کریم میں امت مسلمہ کے نام سے مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ امت زمان ومکان سے ان معنوں میں ماوراء ہوتی ہے کہ وقت کے کسی بھی لمحے میں خواہ وہ ماضی ہو، حال ہو، مستقبل کوئی شخص بھی اسلام قبول کر لیتا ہے اور اعمال صالحہ انجام دیتا ہے تو وہ اس امت کا فرد شمار ہوتا ہے حضور اکرم ﷺ کی امت کو سب امتوں پر فضیلت دی گئی ہے یہ فضیلت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی وجہ سے نصیب ہوئی ارشاد نبوی ﷺ ہے **وعدنی ربی سبحانہ ان یدخل الجنة من امتی سبعین الفاً لاحساب علیھم ولاعذاب، مع کل الفٍ سبعون الفاً** (۲۴) ''میرے رب نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ میری امت میں سے ستر ہزار شخص بغیر حساب وکتاب کے جنت میں جائیں گے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور ہونگے۔'' اکثر احادیث میں آپ ﷺ امت مسلمہ کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا **لکل نبی دعوة دعوھا، فارید ان اختبیئ دعوتی شفاعة لامتی یوم القیامة** (۲۵) ''ہر نبی کے لئے ایک دعا ہے جو سنی جائے گی پس میں چاہتا ہوں کہ میری وہ دعا قیامت کے دن میری امت کی شفاعت کے لئے پوری ہو۔'' اپنی امت کی فضیلت بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا **نحن الآخرون و نحن السابقون یوم القیامة،۔۔۔۔۔۔الیھود غداً والنصاریٰ بعد غدٍ** (۲۶) ''قیامت کے دن ہم ہی آخری ہوں گے اور ہم ہی سبقت لے جانے والوں میں سے ہوں گے۔ بے شک ہر امت کو ایک کتاب دی گئی ہے ہم سے پہلے اور ہم سے بعد بھی، پس یہ اس دن کے لیے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہدایت دی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے ساتھ، پس لوگ اسکی اتباع کرتے ہیں جن میں یہود کل کریں گے اور نصاریٰ پرسوں۔'' ایک اور حدیث میں اپنی امت کی فضیلت یوں بیان فرمائی **اعطیت مالم یعط احد من الانبیاء۔۔۔۔نصرت بالرعب و اعطیت مفاتیح الارض وسمیت احمد وجعل التراب لی طھوراً وجعلت امتی خیر الامم** (۲۷) ''مجھے وہ فضیلتیں بخشی گئی ہیں جو کسی

اور نبی کو حاصل نہ تھیں۔۔۔دشمن کے دل میں خوف ڈال کر میری مدد کی گئی، مجھے دنیا کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئیں، میرا نام احمد رکھا گیا، مٹی کو میرے لئے طہارت بنایا گیا اور میری امت کو تمام امتوں میں سے سب سے بہتر امت بنایا گیا۔'' ان احادیث سے ظاہر ہوتا کہ امت سے مراد وہ گروہ انسانی جس کی نسبت کسی نبی کی طرف ہو۔

قوم کا مفہوم:

قوم کا لفظ عام طور پر اجتماع انسانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔قوم کی جمع اقوام ہے۔'لسان العرب' میں لفظ 'قوم' کے درج ذیل معنی تحریر کیے گئے ہیں **والقوم :الجماعة من الرجال والنساء جميعاً** (۲۸)القوم:اسم جمع۔مردوں اور عورتوں کا گروہ۔ابن منظور لکھتے ہیں **وقيل: هو للرجال خاصة دون النساء** (۲۹)''اور کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد صرف مرد ہیں عورتیں نہیں۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اہل لغت کے نزدیک اس لفظ 'امت' سے مراد صرف مردوں کا گروہ ہے۔ابن منظور اس قول کی تائید میں ارشاد الٰہی سے استشہاد کرتے ہیں جو یہ ہے **لا يسخر قوم من قوم۔۔۔ خيراً منهن** (۳۰) نہ مذاق اڑائیں مرد مردوں کا ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔اس آیت میں قوم سے صرف مردوں کا گروہ مراد ہے اگر عورتیں اس کے مفہوم میں شامل ہوتیں تو ان کے لئے الگ 'نساء' کا لفظ لانے کی ضرورت نہ تھی۔امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں قوم: **يقال قام يقوم قياماً فهو قائم و جمعة قيام، و اقامه غيره و اقام بالمكان اقامة** (۳۱) قوم: کہا جاتا ہے قام یقوم قیام فھو قائم، اس کی جمع قیام ہے۔اسکا قائم کرنا اسکے غیر کو اور کسی مکان میں اقامت دینا۔المنجد میں قوم کا مفہوم یہ ہے کہ :**لقوم: الاقامة بالمكان۔ جمع : اقوام و اقاوم و اقائم و اقاويم:الجماعة من الناس قوم الرجل : اقرباؤ ه الذين يجتمعون معه فی جدٍ واحدٍ** (۳۲) قوم سے مراد کسی جگہ سکونت پذیر (آبادی)، اس کی جمع اقوام اقاوم اور اقاویم ہے۔انسانوں کی جماعت میں سے مردوں کا گروہ۔ایک نسل سے تعلق رکھنے والے رشتہ دار۔'قاموس مترادفات' کے مطابق قوم کے معنی ہیں ذات۔فرقہ۔گروہ۔نسل۔جماعت۔اہل وطن۔قبیلہ۔ملت۔امت۔نیشن۔شعب۔گروہ مردمان (۳۳)

مذکورہ بالا تمام (سوائے آخری ایک کے) مفاہیم میں عورت مرد دونوں شامل ہیں۔ظاہر ہے نہ تو ایک قبیلہ عورت کے بغیر مکمل ہوسکتا ہے نہ وطن اور نہ نسل۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں قوم کا مفہوم یہ ہے کہ ''قوم کسی علاقہ یا خطہ میں افراد کا وہ مخصوص گروہ، جو ایک ہی نسل سے متعلق ہو۔جس کی تہذیبی، تاریخی اور لسانی روایات مشترک ہوں۔اصلاً یہ اصطلاح اس مفہوم کو ظاہر نہیں کرتی جو انگریزی کے لفظ Nation کا مفہوم ہے۔'' (۳۴) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ایک قوم کے افراد میں نسلی، تہذیبی، تاریخی یا لسانی اشتراک ہونا ضروری ہے۔''لسان العرب' میں کہا گیا ہے کہ **وقوم كل رجل: شيعته وعشيرته** (۳۵)'' قوم سے مراد کسی آدمی کے حامی، طرفدار اور رشتہ دار ہیں۔'' اس کا مطلب ہے کہ کسی قوم کا حصہ بننے کے لئے یہ دونوں یا ان میں سے ایک نسبت کا ہونا ضروری ہے۔اس معنی میں یہ لفظ حدیث میں بھی آیا ہے **ومن تولى قوماًبغير اذن مواليه ، فعليه لعنةالله والملائكة والناس اجمعين** (۳۶)''جو شخص کسی قوم کے ساتھ اپنے موالی (سرپرستوں) کی اجازت کے بغیر تعلق پیدا کرتا ہے، اس پر اللہ کی، اس کے

فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت وارد ہوتی ہے۔"

قوم قرآن وحدیث کی روشنی میں:

قرآن کریم میں قوم کا لفظ گروہ یا جماعت کیلئے استعمال ہوا ہے۔ایک وہ عام گروہ اور جماعت جو ایک نسل اور ایک وطن سے تعلق رکھنے والی ہو، دوسری وہ جو ایک نسب یا وطن سے تعلق رکھنے والی جماعت ہو۔قرآن کریم کی رو سے ہر پیغمبر نے 'قوم' کہہ کر براہ راست مردوں کو خطاب کیا اور بالواسطہ عورتوں کو اور نزولِ عذاب جسطرح نافرمان منکر مردوں پر ہوا اسی طرح عورتوں پر بھی۔عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جو اسم جمع آدمیوں کی جماعت کیلئے ہو اس کا استعمال بطور تذکیر بھی جائز ہے اور بطور تانیث بھی جیسے: **کذب به قومک (۳۷) اور کذبت قبلهم قوم نوح (۳۸)** قرآن مجید میں اس لئے قوم مذکر بھی مستعمل ہے اور مونث بھی

قرآن مجید میں قوم کا لفظ لام تعریف (ال) کے بغیر عام لوگوں کے معنی میں اس طرح استعمال ہوتا ہے جس معنی میں انگریزی زبان کا لفظ People استعمال ہوتا ہے جیسے: **ذٰلِکَ بِأَنَّھُمْ قَوْمٌ لاَیَعْقِلُون (۳۹)** یہ اس لئے کہ بیشک وہ بے عقل لوگوں کا گروہ ہے۔اسی طرح قرآن مجید میں یہ اصطلاح عام طور پر ان لوگوں یا گروہوں کے سلسلے میں استعمال ہوتی ہے جو نبی کریمؐ سے پہلے کے انبیاء سے متعلق تھے مثلاً قوم ابراہیم، قوم لوط قوم نوح وغیرہ اور نبی کریمؐ کے ذکر میں بھی استعمال ہوئی ہے جیسے: **وَ کَذَّبَ بِهٖ قَوْمُکَ وَھُوَ الْحَق (۴۰)** تیری قوم نے اس (قرآن) کو جھٹلایا حالانکہ وہ حق ہے۔اس سے مراد انبیائے کرام کی دعوت کے مخاطب لوگ ہیں۔ارشاد الٰہی ہے: **کَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَة۔۔۔۔ وَاللّٰهُ یَھْدِیْ مَن یَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴۱)** پہلے تو سب لوگ ایک ہی امت تھے لیکن لوگ آپس میں اختلاف کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کیں تا کہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے تھے ان میں فیصلہ کردیں اور اس میں اختلاف بھی انہی لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی باجود یکہ ان کے پاس کھلے ہوئے احکام آ چکے تھے اور یہ اختلافات انہوں نے صرف آپس کی ضد سے کیا تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اہل ایمان کو اس کی راہ دکھادی اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھادیتا ہے۔

اس میں واضح الفاظ میں یہ حقیقت بتائی گئی ہے کہ ابتدا میں سب لوگ ایک امت (امت واحدۃ) تھے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لفظ امت کا اطلاق مشترکہ عقائد ونظریات والے گروہ پر ہوتا ہے۔جب ان کے عقائد میں فرق آ گیا۔اب وہ ایک قوم تو رہیں گے ایک امت نہیں کہلا سکتے۔یعنی آپس میں عقائدی اختلاف رکھنے والے ایک امت نہیں بلکہ قوم کہلائیں گے۔مختلف اقوام میں انبیاء کی بعثت کا مقصد ہی لوگوں کے نظریاتی اختلاف کو مٹا کر انہیں پھر سے ایک امت بنانا تھا۔انبیاء کرام کی جدوجہد اور تبلیغ واصلاح کے بعد انسان دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ایک وہ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام کے متبع ہو گئے ان کو مومن کہا جاتا ہے۔دوسرے وہ جنھوں نے آسمانی ہدایات اور انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا ان کی بات نہ مانی یہ لوگ کافر ہیں۔اب یہاں سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لفظ امت کا اطلاق صرف ہدایت یافتہ گروہ یعنی مومنین پر ہوتا ہے یا کافروں کو بھی امت کہا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ صرف مومنین سے متعلق ہوتا تو مذکورہ بالا آیت قرآنی میں صرف امت کہہ دینا ہی کافی

ہوتا امت واحدۃ کہنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔قرآن میں ایک اور مقام پر بھی اس کی دلیل موجود ہے۔ازروئے قرآن بنیادی طور پر پوری نوع انسانی دوگروہوں میں منقسم ہے ایک مومن اور دوسرا کافر: وَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنکُمْ کَافِرٌ وَ مِنکُم مُّؤْمِنٌ (۴۲)''اس نے تمہیں پیدا کیا سوتم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مومن۔''یعنی نوع انسانی میں دوگروہ ہیں ایک مومن اور دوسرا کافر۔اس آیت کے مطابق قرآن کریم نے لفظ'امت' انسانوں کے دونوں گروہوں (مسلمان اور کافر) کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔چونکہ امت کا اطلاق ایک عقیدہ اور ایک نظریہ پر متفق لوگوں کی جماعت پر ہوتا ہے لہٰذا کافر بھی ایک عقیدہ کفر پر متفق ہونے کی بناء پر ایک امت ہیں۔جمہور فقہاء بھی اس سے متفق ہیں کہ اہل کفر ایک ملت ہیں انکے مطابق حدیث لا یتوارث اھل ملتین شتیٰ (۴۳)''مختلف ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے۔''اس میں 'ملتین' سے دوملتیں مراد ہیں اسلام اور کفر۔امت کے افراد کے روابط باہمی صرف عقیدہ کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اس کے نزدیک دوسرے اعتبارات کی کوئی حیثیت نہیں۔لہٰذا جب حضرت ابراہیم نے منصب ''امامت'' اپنی نسل میں باقی رہنے کے متعلق اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تو اللہ نے فرمایا: قَالَ إِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ إِمَاماً قَالَ وَمِن ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لاَ یَنَالُ عَهْدِیْ الظَّالِمِیْنَ (۴۴) فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) میں تمہیں (ابراہیم کو) لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، کہا ابراہیم نے اور میری اولاد سے فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) میرا وعدہ ظالموں سے منسلک نہیں ہے۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اپنے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا تو وہاں بھی نسبی رشتہ تعمیل حکم کے آڑے نہ آسکا بلکہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کو قربان کرنے پر تیار ہوگئے۔اور بالکل اسی طرح طوفان نوح کے وقت جب حضرت نوح نے اپنے مشرک بیٹے کو ڈوبتا دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے فریاد کی کہ تو نے تو میرے اہل وعیال کو بچانے کا وعدہ کیا تھا تب ارشاد ہوا قَالَ یَا نُوحُ إِنَّهُ لَیْسَ مِنْ أَهْلِکَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ (۴۵)''فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) اے نوح وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امت کے مفہوم میں نسل ونسب، رنگ وزبان ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی بلکہ محض اتحادِ ایمان وعقیدہ ہی امت کی بنیاد تھی۔جہاں تک لفظ قوم کا تعلق ہے تو اس کا اطلاق اس گروہ انسانی پر ہوتا ہے جس میں ان دونوں قسم کے نظریات کے حامل افراد شامل ہوتے ہیں۔جیسا کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر قوموں کے تذکرے میں اس طرح کے الفاظ لائے گئے ہیں کہ قوم نوح، قوم صالح، قوم ھود، قوم موسیٰ، قوم عیسیٰ وغیرہ۔قوم الفاسقین، قوم الجاہلین، قوم الصالحین جیسے الفاظ بھی آئے ہیں۔

ان آیات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ لفظ قوم کا اطلاق ایک ایسے گروہ انسانی پر ہوتا ہے جس میں مومن وکافر دونوں شامل ہیں۔اگرچہ لفظ امت کا اطلاق بھی ان دونوں گروہوں پر کیا جاسکتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ کسی ایک امت میں ایک ہی عقیدے کے لوگ شامل ہوتے ہیں دوسرے عقیدے کے لوگ دوسری امت کہلائیں گے۔لیکن ایک قوم کے اندر تمام متفق ومختلف نظریات کے حامل افراد شامل ہوتے ہیں۔جیسا کہ قوم نوح، قوم عاد وقوم ثمود وغیرہ کہ ان میں مسلمین ومکذبین تمام کے مجموعہ کو قرآن نے لفظ قوم سے مخاطب کیا ہے۔

انبیاء کا تصورامت وقوم:

پہلے انسان اللہ کے پہلے نبی اور ہدایت یافتہ پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام تھے۔انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع رہ کر فرمائی۔انہیں مرضیات وغیر مرضیات کا پورانظام سمجھایا۔آپ کے بعد ایک طویل عرصے تک نسل انسانی ہدایت پر ہی رہی اور مرضیاتِ الٰہی کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالتے رہے۔یہ نیکی اور راستبازی کا دور کب تک رہا؟ اور کب انسانیت راہ راست سے گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک گئی؟ اس بارے میں مختلف اقوال ونظریات ملتے ہیں۔اس بارے میں مولانا مودودی(۱۹۷۹ئ) اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا اس کو بتادیا تھا کہ حقیقت کیا ہے، تیرے لئے صحیح راستہ کونسا ہے اس کے بعد ایک مدت تک نسل آدم راہ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی۔پھر لوگوں نے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے اس وجہ سے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہشمند تھے۔اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بناڈالے اور اپنی ایک نئی امت بنالے بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہ حق کو واضح کر کے انہیں پھر سے ایک امت بنادیں۔''(۴۶)

مولانا کے اس بیان کے مطابق انسانیت کی ابتداہدایت سے ہوئی۔یعنی ابتدا میں تمام نسل آدم ہدایت پر ہونے کی وجہ سے ایک امت تھی مولانا کے مذکورہ بیان کے الفاظ''ایک مدت تک نسل آدم راہ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی۔''ظاہر کر رہے ہیں کہ آپ کے نزدیک امت سے مراد راہ راست پر قائم گروہ ہے۔جب یہ گروہ راہ راست پر قائم نہ رہا تو اللہ نے یکے بعد دیگرے متعدد انبیاء بھیجے جن کا مقصد لوگوں کو دوبارہ ہدایت پر جمع کر کے ایک گروہ یعنی ایک امت بنانا تھا تاریخ میں امت مسلمہ ان لوگوں کے مجموعے سے وجود میں آئی تھی جنہوں نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا تھا خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھنے والے ہوں۔پیشتر تمام نبوتیں مخصوص گروہوں کے لیے تھیں۔تمام انبیاء کے نزدیک بھی امت کا یہی مفہوم مراد تھا۔کتاب مقدس میں ہے''اور اسی روز خداوند نے ابراہیم سے عہد کیا اور فرمایا کہ یہ ملک دریائے مصر سے لے کر اس بڑے دریا یعنی دریائے فرات تک، میں نے تیری اولاد کو دیا۔''(۴۷)''دیکھ میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر انجام نہیں کہلائے گا بلکہ تیرا نام ابراہام ہوگا کیونکہ مین نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرادیا ہے۔اور میں تجھے بہت برومند کروں گا اور تو میں تیری نسل سے ہوں گی اور بادشاہ تیری اولاد میں سے برپا ہوں گے اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کی سب پشتوں کے لیے اپنا عہد جو ابدی عہد ہوگا باندھوں گا تا کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہوں اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے۔''(۴۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا یہ عہد تھا کہ وہ اس کی نسل کو مصر سے لے کر دریائے فرات تک کا علاقہ دے گا۔مگر یہ عہد آج تک اسحاق کی نسل سے،جس سے عبرانی یا بنی اسرائیل بنے ہیں پورا نہیں ہوا۔چار ہزار سال گزرنے کے باوجود، یہ وعدہ

الٰہی پورا نہیں ہوا، خدا کا وعدہ ہوا اور معاذ اللہ وہ پورا نہ ہو، عہد میں یہ ذکر بھی ہے کہ اسحاق کی نسل ستاروں کی طرح بکثرت ہوگی اور یعقوب کی نسل زمین کے ذروں کی مانند ہوگی مگر چار ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے، ان دونوں کی نسلیں ستاروں اور زمین کے ذروں کی طرح بکثرت نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے کیے گئے اپنے اس عہد کی تکمیل کے لئے اور آل ابراہیم کو ملتِ ابراہیم بنانے کی غرض سے بنی اسرائیل میں کئی انبیاء بھیجے۔ انہوں نے انہیں دین وشریعت کے اصل مفہوم ومعنی سے روشناس کرانے اور انہیں امت مسلمہ اور امت واحدہ بنانے کی سعی وجدوجہد کی۔ کیونکہ یہ بنی اسرائیل اپنے وقت کے مسلم تھے جن کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے: یَا بَنِیۡ إِسۡرَائِیلَ اذۡکُرُواۡ نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡ أَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَأَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعَالَمِینَ (۴۹) اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے تم پر فرمائیں اور بے شک میں نے تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔ ان کے باپ نے مرتے وقت انہیں وصیت کی تھی کہ: وَوَصَّی بِہَا إِبۡرَاہِیمُ بَنِیہِ وَیَعۡقُوبُ یَا بَنِیَّ إِنَّ اللّہَ اصۡطَفَی لَکُمُ الدِّینَ فَلاَ تَمُوتُنَّ إَلاَّ وَأَنتُم مُّسۡلِمُونَ (۵۰) اور وصیت کی ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوبؑ نے (اپنے بیٹوں کو) اے بیٹوں بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اس دین کو پسند فرمایا پس تم نہ مرنا سوائے اس کے کہ تم مسلمان ہو۔ مگر ان کی نسل جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی زمانے کے اثرات ان پر پڑتے رہے اور یہ بنی اسرائیل مسلمانی چھوڑ کر یہودی بن گئے۔ اور اب جب قرآن نے ان سے خطاب کیا تو کہا: یایھا الذین ھادوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یعنی اے وہ لوگ جو یہودی بن گئے ہو (پہلے مسلمان تھے اب یہودی بن گئے ہو۔) حضرت موسیٰ کی تمام تر کوششیں بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ یہودیوں پر جب دین حنیف کا غلبہ کم ہوا اور نسل پرستی کا بھوت سوار ہوا تو انہوں نے مسلم کے بجائے یہودی کہلوانا زیادہ پسند کیا۔ حالانکہ اگر نسلی نام ہی رکھنا تھا تو ابراہیمی، اسحاقی یا یعقوبی بھی کہلوا سکتے تھے لیکن ان بدبختوں نے انبیاء اور ہادی ورہنماؤں کو چھوڑ کر ایک غیر نبی کی طرف خود کو منسوب کیا جو ان کی عقائدی کمزوری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جب ان میں دینی لحاظ سے مزید تنزل وپستی کا دور آیا تو یہودیت وعیسائیت نے جنم لیا۔

حضرت موسیٰؑ کا دور امت کی تشکیل جدید کا دور کہا جا سکتا ہے جس میں شریعت کا اجراء لازمی بات ہے۔ اس مقصد کے لئے جب حضرت موسیٰ کی قیادت میں تمام بنی اسرائیلیوں کو جبل طور بلایا گیا تو ان نافرمانوں نے الٰہی احکام قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ شریعت کا نفاذ نہ ہونے کے باعث یہ قوم شرعی استحکام سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔ لہٰذا اب یہ ایک انتہائی مفاد پرست گروہ انسانی کی حیثیت سے تو اس دنیا میں باقی ہے لیکن امت مسلمہ والی شرعی اصطلاح کا استحقاق کھو چکی ہے۔ غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اسے بہت قوموں کا باپ بنائے گا اور اسکی نسل سے بہت سی قومیں نکلیں گی جن سے بادشاہ ہوں گے۔ یہ باتیں بھی بنی اسرائیل کی نسبت پوری نہیں ہوئی نہ ہی قوموں میں انہیں کثرت حاصل ہوئی ہے اور نہ ہی چند گنتی کے بادشاہوں کے علاوہ ان میں کوئی بادشاہ ہوئے ہیں۔ لیکن یہ تمام عہد ابراہیم علیہ السلام کے بعد عربوں کی نسبت پورا ہو گیا ہے۔ فلسطین، مصر، عراق علاقوں کے مالک ہوئے، یہاں تک کہ وہ یورپ اور مغرب میں بحر اطلس اور مشرق میں چین تک پہنچے اور اسلامی حکومت کو اسقدر وسعت ہوئی کہ براعظم اس کے زیر نگیں ہو گئے۔ اگر بنی اسماعیل کو اس عہد سے خارج کر دیا جائے تو تمام وعدہ الٰہی باطل قرار پاتا ہے اور اس بات سے خدا کی پناہ کہ وعدہ الٰہی جھوٹا ثابت ہوا۔ یہ وعدہ ابراہیم علیہ السلام کی اس نسل کے ذریعہ پورا ہوا جو اسمٰعیل علیہ السلام سے ہوئی۔ مسلمان خواہ کسی باپ کی اولاد ہوں وہ ابراہیم کے فرزند ہیں جیسے کہ ارشادِ الٰہی ہے: وَقَالُواۡ کُونُواۡ ہُوداً أَوۡ نَصَارَی۔۔۔۔ الۡمُشۡرِکِینَ (۵۱) اور وہ کہتے ہیں کہ یہودی بنا جاؤ یا نصرانی تو تم ہدایت پا جاؤ گے کہہ دو کہ ابراہیم کی ملت ہی یکسو ہے

اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ نسلی برتری وتفاخر کے جذبے نے مسلم اور بنی اسرائیلی گروہ کو ایسا یہودی بنایا کہ یہ پھر کبھی ملت اسلام میں واپس نہ آسکا۔ بعثت نبوی ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ملت ابراہیمی کی طرف لوٹانے کا آخری موقع تھا جو ان بدبختوں نے اپنی ہٹ دھرمی اور جھوٹی انا پرستی میں گنوا دیا۔ جس نسل میں انبیاء کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا رحمت خداوندی سے ایسا محروم ہوا کہ اب احادیث کے مطابق اس میں محض دجال مردود کا ظہور باقی ہے۔ قرآن نے سچ کہا ہے کہ: وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ (۵۲) ''جسے اللہ روشنی سے محروم کر دے اسے کہیں بھی روشنی نہیں مل سکتی۔'' حضرت عیسیٰ کی دعوت حقیقت میں صرف اور صرف بنی اسرائیل کے لئے تھی۔ قرآن حضرت عیسیٰ کے وصف میں کہتا ہے کہ: وَرَسُولاً إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ ۔۔۔۔ طَيْراً بِإِذْنِ اللّهِ (۵۳) اور بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا ہوں بے شک میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح نشانیاں لے کر آیا ہوں میں مٹی سے پرندوں کی مانند بناتا ہوں پھر ان میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندے بن جاتے ہیں۔

اسی لئے آپ نے اپنی دعوت دین کو بھی صرف اسی گروہ تک محدود رکھا متداول انجیلوں میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا'' میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔'' (۵۴) اس لیے مسیحیت نے امت کا وہ تصور پیش نہیں کیا جس میں متعدد اقوام شامل ہوں۔ اس کے برخلاف عملی پہلو سے وہ مخصوص حالات کے نتیجے میں بلا ارادہ اپنے دائرہ سے باہر نکلی اور متعدد قوموں نے اسے قبول کیا لیکن وہ انہیں اپنی ایک امت کے تحت جمع کرنے پر قادر نہ ہوسکی اس لئے کہ ایسا کرنا اسکے مقاصد میں شامل نہ تھا۔ تورات میں پہلا عہد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے پختہ عہد کیا کہ وہ اس نسل کو دریائے مصر سے دریائے فرات تک کا علاقہ دے گا۔ یہود نے خیال کیا کہ نسل سے مراد صرف وہی ہیں تب سے وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ایک دن ضرور اللہ کا یہ عہد ان کے حق میں پورا ہوگا اور اس پورے خطے میں صرف ان کی حکومت ہوگی۔ کتاب مقدس میں لکھا ہے'' وہ اسرائیلی ہیں اور لے پالک ہونے کا حق اور جلال اور عہود اور شریعت اور عبادت اور وعدے ان ہی کے ہیں۔ اور قوم کے بزرگ ان ہی کے ہیں اور جسم کی رو سے مسیح بھی ان ہی میں سے ہوا جو سب کے اوپر اور ابد تک خدائے محمود ہے۔'' (۵۵) لیکن یہ عہد حضرت ابراہیم کے زمانے سے لے کر آج تک پورا نہیں ہوا۔ جبکہ اگر اس عہد کا مصداق حضرت ابراہیم کی دوسری لڑی یعنی اسماعیلی (عرب) مراد لیں تو یہ عہد ایک حقیقت مشہورہ بن جاتا ہے۔ وہی قدیم سے آج تک اس زمین کے مالک ہیں اور اکیلے عرب ہی جزیرہ عربیہ ہیں جس میں عراق اور شام بھی شامل ہیں اس کے صحیح حقدار ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام اسرائیلی، یہوری وغیرہ ایک نسل حضرت ابراہیم کی لڑی سے ہونے کی بناء پر ایک قوم ہیں لیکن عقائدی فرق کی وجہ سے ایک امت نہیں کہہ سکتے۔

جناب یسوع مسیح کی تعلیمات خود منہ سے بولتی ہیں کہ وہ نہ ساری دنیا کے لیے پیام ہدایت کی حیثیت رکھتی ہیں نہ ہر دور اور ہر زمانے کے لیے رہنمائی کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ جہاں تک بنیادی تعلیمات اور پیغام کا تعلق ہے جناب یسوع کا دین اسلام سے مختلف کوئی دین نہیں تھا لیکن اس میں زندگی کے ہر شعبہ اور ہر پہلو ہر دور اور ہر زمانے اور روئے زمین کے ہر حصہ کے لیے جامع ہدایت اور رہنمائی موجود نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اسلام میں امت ابتدا ہی سے قومی مفہوم سے الگ اور ممتاز رہی۔ اسلامی فتوحات کے

بعد بہت سی غیر عرب قوموں نے اسلام قبول کیا اور اسی سانچے میں ڈھل کر ایک امت بن گئیں۔ اس لیے دینی امت کے عناصر اور اجزائے ترکیبی تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی کیونکہ اسلامی عقیدہ اور اقدار نے انہیں اس سے بے نیاز کر دیا تھا۔

امت کی حدود و دائرہ کار:

لفظ 'امت' کے معنی جماعت، زمانہ اور دین و ملت ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کتاب اللہ میں مؤخر الذکر دونوں معنی کے لیے یہ لفظ لایا گیا ہے وہاں پر بھی مراد پہلا معنی ہی تھا جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے کہ **وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَى أُمَّةٍ مَعْدُودَةٍ** (۵٦) "اور اگر ہم خاص مدت تک انکی سزا کو ٹالتے ہیں۔" لہٰذا ہم لفظ 'امت' کے معروف اور مروجہ معنی "جماعت" کے پس منظر میں اسکی حدود اور دائرہ کار کا جائزہ لیتے ہیں۔ 'جماعت' کے معنی میں بھی لفظ 'امت' متعدد انواع و اجناس اور گروہوں کے لیے کلام اللہ میں آیا ہے۔ ان جاندارں میں سے بعض ایسے ہیں جو جالے بنتے ہیں جیسے مکڑی، بعض ذخیرہ اندوزی کرتی ہیں جیسے چیونٹی، بعض ایک وقت کی روٹی پر اکتفا کرتی ہیں جیسے گوریا اور فاختہ وغیرہ ہر صنف تلاش رزق بلاکت کی جگہوں سے احتراز اور وسائل کی تلاش میں بنی آدم کے مثل ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الأَرْضِ وَلاَ طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلاَّ أُمَمٌ أَمْثَالُكُم** (۵۷) اور نہیں کوئی زمین پر چلنے والا اور کوئی پرندہ اپنے پروں پر اڑنے والا مگر یہ کہ ایک جیسی امتیں ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت قتادہ کی روایت ہے کہ الطیر امۃ و لانس امۃ و الجن امۃ (۵۸) "پرندے ایک امت ہیں اور انسان ایک امت ہیں اور جن بھی ایک امت ہیں۔" صاحب لسان اس حوالے سے لکھتے ہیں **ان اللہ خلقھم و تعبدھم بماشاء ان یتعبدھم من تسبیح و عبادۃ علمھا منھم و لم یفقھنا ذلک** (۵۹) "اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے اور انکے لیے تسبیح و عبادت کا ایک مخصوص طریقہ متعین کیا ہے جو ہمیں معلوم نہیں ہے۔" یعنی اللہ تعالیٰ کی نظر میں اسکی تمام مخلوقات ایک گروہ یا ایک جماعت کی مانند ہیں وہ اپنی جماعت کی کس نوع سے غافل نہیں ہے۔

کلام اللہ میں لفظ امت زیادہ تر نوع انسان کے لیے لایا گیا ہے لیکن چونکہ اس نوع کے اندر فکر اور ذہنیت کے لحاظ سے اختلاف موجود ہے۔ اس لحاظ سے انسانوں کے اندر کئی گروہ اور جماعتیں بن چکی ہیں لہٰذا وحی الٰہی میں جو خاص طور پر نوع انسان سے مخاطب ہے عمومی لحاظ سے تمام انسانوں سے خطاب کے بعد خصوصی طور پر ہر مکتبہ فکر سے بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ لیکن اس تمام خطاب میں خاص بات یہ ہے کہ ہر گروہ اور مکتبہ فکر سے اندازِ گفتگو ایک ہی ہے یعنی سب کو ایک ہی لفظ امت سے پکارا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے **وَإِذَ قَالَتْ أُمَّةٌ مِنْهُمْ** (٦٠) "اور جب ان میں ایک جماعت نے کہا۔" اس میں چونکہ خطاب بنی اسرائل سے ہو رہا ہے لہٰذا امت سے مراد بنی اسرائیل کی ہی ایک جماعت ہے۔ انسانی جماعت کی مزید تخصیص کرتے ہوئے ارشاد فرمایا **كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ** (٦١) "تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کو نیک کام کا حکم کرنے اور برے کام سے روکنے کے لیے بنائی گئی ہو۔"

اس میں ابنیاء کی دعوت قبول کرنے والے گروہوں میں سے ایک خاص جماعت یعنی آخری نبی کے پیروکار مراد ہیں جنہیں سلسلہ نبوت کے اختتام پذیر ہونے کے بعد آئندہ آنے والے انسانوں کی ہدایت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔اس گروہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے مزید تخصیص فرمائی ہے وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۶۲)''اورتم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جولوگوں کو نیکی کی طرف بلائے ،اچھے کام کا حکم دے اور برے کام سے روکے۔''اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے مخاطب ہیں کہ اسے مسلمانو، اے آخری نبی کی امت تمہارے اندر ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جس کا کام ہی صرف نیکی (معروفات) کو پروان چڑھانا اور برائی (منکرات) کے مواقع کا سدِ باب ہو۔یعنی مسلمانوں میں سے کچھ لوگ دنیاوی امور سے ہٹ کر خود کو صرف اس مقصد کے لیے وقف کردیں۔اس گروہ کا صرف یہ کام ہو کہ وہ لوگوں کی اصلاح کرے۔

قرآن کریم میں ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں فرد واحد کو امت کہا گیا ہے ارشادالٰہی ہے إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتاً لِلّٰهِ حَنِيفاً وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۶۳)''واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم ایک امت تھے اللہ کا مطیع فرمان اور یکسو وہ کبھی مشرک نہ تھے'' تنہا ایک شخص حضرت ابراہیم کو پوری ایک جماعت کہنے کی مصلحت یہ ہے کہ ان کی ذات میں وہ تمام خصوصیات وصفات مجتمع تھیں جو ایک جماعت میں ہوسکتی ہیں۔مثلاً: وفاء۔النجم ۳۷،شکر۔النحل ۱۲۱،ایمان۔الصافات ۱۱۱،اسلام۔آل عمران ۶۷ الصافات ۱۰۳،حنیفیت۔النحل ۱۲۰ آل عمران ۶۷،قنوت۔النحل ۱۲۰،اجتبایٰ۔النحل ۱۲۱،ادابیت۔ھود ۷۵،افابت۔ھود ۷۵،برکت۔الصافات ۱۱۳،اصطفاء۔البقرہ ۱۳۰،حلم۔ھود ۷۵،پر۔ص ۴۵،صبر۔ص ۴۵،نبوت۔المریم ۴۱،رسالت۔النساء ۵۴،رسالت۔النساء ۱۲۵،سلامتہ قلب۔الصافات ۸۴،صدیقیت۔المریم ۴۱،ثنا ربانی۔المریم ۴۱،حجت۔الانعام ۸۳،صلاح۔البقرۃ ۱۳۰،رشد۔الانبیاء ۵۱، احسان۔الصافات ۱۵،حکمت۔النساء ۵۴،امام۔البقرہ ۱۳۴

قوم کی حدود ودائرہ کار:

قوم کا لفظ ہر دور میں 'جماعت' کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔اسکے مختلف نظریات ملتے ہیں اس کی حدود اور دائرہ کار کو سمجھنے کے لیے پہلے ہمیں اس بات کو سمجھنا ہوگا کہ قوم کی اصطلاحی ومنطقی تعریف کیا ہے؟اس کے تخلیقی وتشکیلی عناصر کون سے ہیں؟ان میں سے کون سے عناصر اولیت رکھتے ہیں اور کون سے ثانوی نوعیت کے ہیں؟ یعنی اس کی حدود کا تعین تب ہی ہوسکتا ہے جب ہم اسکے آغاز وارتقاء اور اسکے پیچھے کارفرما قوتوں کو جان لیں۔اس مقصد کے لیے ہم لفظ 'قوم' کا پہلے قرآن کی رو سے اور پھر عصر حاضر کے تناظر میں جائزہ لیتے ہیں۔

قرآن کریم میں عام طور پر یہ اصطلاح انبیاء کی اقوام کیلئے آئی ہے جس سے مراد انبیاء کی دعوت کے مخاطبین ہیں۔اسی مفہوم کی بنیاد پر گذشتہ اقوام برپا ہوئی تھیں۔چونکہ سابقہ تمام نبوتیں مخصوص بالزمان تھیں اس لئے ان پر امت کے لغوی مفہوم کا اطلاق ہوگا جس کی رو سے امت وقوم ہم معنی ہیں۔اسی لئے تاریخی اعتبار سے امت کا دینی اور قومی مفہوم دونوں گڈمڈ ہوگئے اور نظری پہلو کی طرح

عملی پہلو سے بھی اس کی وضاحت نہ ہوسکی۔ اسکے برخلاف آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام تھی اس لئے بہت سی غیر عرب قوموں نے بھی اسلام قبول کیا۔ اس طرح تاریخ میں امت مسلمہ ان لوگوں کے مجموعے سے وجود میں آئی تھی جنہوں نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا تھا خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھنے والے ہوں۔ اس طرح نظری اور عملی دونوں پہلوؤں سے امت کا اسلامی مفہوم واضح رہا اور تاریخ میں ایسی امت ظاہر ہوئی جس میں متعدد قومیں شامل تھی

آپ ﷺ کو پہلے اپنے رشتہ دار اور اہل قبیلہ کو دعوت دین دینے کا حکم ہوا وَ أَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (۶۴)''اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو (اللہ سے) ڈراؤ۔'' حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں کہ:''اس امام کیلئے جو مختلف قوموں کو ایک فکر پر جمع کرے چند اصول کار ضروری ہونگے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ پہلے ایک قوم کو راہِ راست کی طرف بلائے گا اور اسی کے اخلاق کو ٹھیک کر کے انکی حالت کی اصلاح کریگا۔ پھر اسے اپنی تحریک کی اشاعت کیلئے آلہ کار بنائے گا اور اس کی مدد سے دنیا کی دوسری قوموں سے جہاد کریگا۔ وہ اپنے (قومی) ساتھیوں کو دنیا کی مختلف قوموں میں بکھیر دیگا۔''(۶۵) شاہ صاحب آپ ﷺ کی تشکیل جماعت کے بارے میں لکھتے ہیں'' آپ ﷺ کی ابتدائی جماعت جو کہ مہاجرین وانصار پر مشتمل تھی اصل میں یہی جماعت قریش اور انکے اردگرد کے قبیلوں کے اسلام لانے کا باعث بنی۔ پھر قریش اور یہ لوگ عراق اور شام کی فتح کا ذریعہ بنے۔ پھر قریش اور عراق وشام کے لوگ فارس اور روم کی فتح کا وسیلہ بنے۔ اور ان کے ذریعے سے ہند، ترکستان اور سوڈان کے علاقے فتح ہوئے۔''(۶۶)

آپ ﷺ کی نبوت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ ملت حنیفیہ ابراہیمیہ پر تمام اقوام عالم کو جمع کرینگے۔ کیونکہ انسان کی نوعی ترقی کا یہی راستہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دعاء 'الفاتحہ' میں اپنے آپ کو ''رب العلمین'' کہا۔ اس تمہیدی دعا کے بعد سورۃ بقرہ وغیرہ باقی قرآن حکیم میں تمام اقوام عالم کے لیے بنیادی دستور حیات دیا گیا ہے جس پر انہیں جمع کیا جائے گا۔ جبکہ آپ ﷺ کو رحمت للعلمین کہہ کر آپ ﷺ کی دعوت کی عالمی حیثیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آپ کی نبوت کا یہ درجہ ہی آپ ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں **الانبیاء قبل النبی ﷺ کانو ایبعثون الیٰ اقوامھم خاصة وبعث نبینا ﷺ کافة الناس** (۶۷) آپ ﷺ سے پہلے کے انبیاء خاص اپنی اقوام کی طرف آئے جبکہ آپ ﷺ تمام انسانوں کے لئے مبعوث ہوئے۔

اس حوالے سے مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں''ہر ایک قوم کی ہدایت کے لیے مختلف درجوں کے رہنمایان انسانیت پیدا ہوتے رہے اور انسانیت آگے بڑھی۔ اب تمام اقوام ملکر رفتہ رفتہ ایک بننا چاہتی ہیں لیکن وہ اس وقت دو بڑے حصوں میں بٹی ہوئی ہیں (۱) مشرقی بلاک (۲) مغربی بلاک۔ قرآن حکیم کے نزول کے وقت بھی کم وبیش یہی حالت تھی۔ وہ ان دونوں کیمپوں کو ملانا چاہتا ہے۔ شرق وغرب کے اس اجتماع کیلئے کتاب عظیم کام دے گی۔ اس لئے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کا تعارف رب اللعالمین کی حیثیت سے کراتی

ہے یعنی سب قوموں کو ملا کر انسانیت کو ترقی دینے والا۔(۶۸)

میثاق مدینہ میں مدینہ کے تمام باشندوں کے لیے ایک قوم کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ اس میں قوم کو مذہب کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنے پورے دور عروج میں ساری امت کو جسدِ واحد ہی سمجھا۔ لہذا ہندوستان میں ایک مسلمان عورت کی فریاد جب عراق کے گورنر حجاج بن یوسف تک پہنچی تو اس کی دادرسی کے لئے محمد بن قاسم کو بھیجا۔ جس نے سارے سندھ پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ ہندوستان میں دوقومی نظریے کا مطلب یہ تھا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسنے والے تمام مسلمان ایک قوم ہیں لیکن کیا 14 اگست 1947ء کے بعد دہلی اور لاہور کا مسلمان ایک قوم رہا؟ ڈھاکہ اور لاہور کے مسلمان دسمبر 1971ء تک ایک قوم کا حصہ تھے لیکن بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ان کی قومیت مختلف ہو۔ پاکستان میں قوم سازی کا عمل کس طرح پروان چڑھ رہا ہے اور اس کے بنیادی عناصر میں کون کون سی چیزیں کارفرما ہیں اس حوالے سے چوہدری نیاز احمد سنگھیڑہ لکھتے ہیں ''کوئی بھی پائیدار قوم شعوری نہیں لاشعوری طور پر ہی پروان چڑھتی ہے اور اسے پروان چڑھنے کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ نیز جبری طریقے سے کوئی قوم تشکیل نہیں پاسکتی۔ (جس طرح آج کل بلوچستان، وزیرستان، سوات، سرحد اور سندھ کے بعض علاقوں میں فوجی آپریشن جاری ہے) اور جب ہم کہتے ہیں کہ ریاست مثبت انداز میں قوم سازی کے عمل کو آگے بڑھائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ عوام کو قوم سازی کے ایک خود ساختہ ٹکسال کی بھٹی میں جھونک دے اور جس طرح چاہے جبراً قوم کی تشکیل کرے۔ یہ طریقہ غلط ہے ریاست کو چاہیے کہ وہ جمہوری اور غیر جانبدارانہ انداز سے دھرتی کے خمیر سے قومی اور تہذیبی اجزاء تلاش کرے اور مختلف قومیتوں کے فی الواقع وجود، رسوم و رواج، عقائد و معتقدات، اخلاق و عادات، مزاج، طبائع، جذبات، رہن سہن، لوک ریت، سماجی اقدار اور موسیقی، شاعری، طب علم و حکمت غرض سب سے یکساں استفادہ کرے۔''(۶۹)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوم سازی کا عمل ایک قدرتی عمل ہے جو انسانوں کے اپنے حقوق کے عدم تحفظ کے احساس سے شروع ہوتا ہے۔ کسی خطے کے لوگوں کو جب اپنے حقوق نہیں ملتے تو وہ انکے حصول کے لئے متحد ہونا شروع کر دیتے ہیں۔ انکا یہ اتحاد بڑھتے بڑھتے ایک منظم جماعت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس خطے کے باقی عناصر بھی اس اتحاد پر اثر انداز ہونا شروع کر دیتے ہیں جیسے زبان، رہن سہن کے طریقے اور اس خطہ کی باقی امتیازی خصوصیات وغیرہ۔ اس طرح بالآخر حصول حقوق اور تحفظ حقوق کا یہ احساس ایک الگ قومیت اور پھر قوم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو بعض اوقات ایک دو نسلوں تک مکمل ہو جاتا ہے لیکن اکثر اوقات کئی کئی پشتوں تک جاری رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ترکیبی عناصر میں تبدیلی آتی رہتی ہے یعنی اکثریتی عنصر غالب آجاتے ہیں لیکن ہر غالب عنصر اس قومیت کو مزید تقویت دیتا جاتا ہے جیسے مذہب، زبان، نسل وغیرہ۔ پاکستانی قوم بھی اسی طرح کے ایک مسلسل عمل کا نتیجہ ہے۔

ایک قوم کی بنیادی اکائیوں میں اتحاد عقیدہ، مذہب، نسل، رنگ، زبان، علاقہ، تہذیب و ثقافت، تاریخ و نفسیاتی ساخت اہم ترین ہیں۔ اسلام مسلمانوں کو محض ایک علاقے تک محدود رہنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ علاقائی اور وطنی حدود سے نکل کر پوری دنیا میں کلمہ توحید بلند کرنے اور پرچم اسلام لہرانے کا حکم دیتا ہے۔ دنیا اللہ کی پیدا کردہ ہے ارشاد الٰہی ہے إِنَّ الأَرْضَ لِلّٰهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ

عِبَادِهٖ (۷۰) ''زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسکا وارث بنا دیتا ہے۔'' ایک قوم کی تخلیق صدیوں پر محیط ارتقائی عمل ہے جس میں زبان براہ راست کردار ادا کرتی ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں **اعلم ان للعباد افعالاً یرضی لاجلھا رب العلمین ۔۔۔۔۔۔ بتعلق الرضا و السخط بتلک الافعال۔** (۷۱) ''واضح ہو کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم میں رسول بھیجتا ہے تو پیغمبر اپنی اپنی زبان میں لوگوں کیلئے اس مذہب کو قائم کرتا ہے پس وہ نبی اس مذہب میں کسی قسم کی کجی باقی نہیں رکھتا۔'' اسکی نظیر یہ قول الٰہی ہے إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِياً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۷۲) ہم نے قرآن عربی زبان میں نازل کیا ہے کہ شائد تم اس کو سمجھ لو۔

شاہ صاحب نے آپ ﷺ کی بعثت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک بعثت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ بنی اسماعیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ اس بعثت کے لیے ضروری ہے کہ شریعت محمدیہ ﷺ کا مادہ وہی شعائر ہوں وہی عبادات کے طریقے ہوں اور وہی انتظامی امور ہوں جو بنی اسماعیل کے پاس موجود تھے۔ اسلئے کہ شریعت لوگوں کے امور متعارف کی اصلاح کیا کرتی ہے نہ کہ ان کو ایسے امور کا مکلف کرے جن کو وہ نہ جانتے ہوں۔ جبکہ حضور پاک ﷺ کی دوسری بعثت یہ ہے کہ آپ ﷺ تمام اہل زمین کے لئے پیغمبر ہیں۔ اس بعثت میں وہ علوم اور تدابیر بھی مندرج ہیں جو تمدن سے متعلق ہیں۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے آپ ﷺ کے زمانہ میں تمام قوموں پر لعنت کی اور انکی سلطنت کے زوال کو مقدر کیا جیسا کہ عجم اور روم کے ساتھ ہوا۔ (۷۳)

امت وقوم کا باہمی تعلق:

حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۷۶ھ) نے انسانی معاشرے، اسکی تاریخ اور ارتقاء کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور وہ قوموں کے عروج وزوال پر ناقدرانہ نظر رکھتے ہیں۔ آپ نے معاشرتی ارتقاء کو چار مراحل میں تقسیم کیا ہے اور اپنی مخصوص اصطلاح میں اسے ارتفاقات کا نام دیا ہے۔ جو یہ ہیں:

۱۔ ارتفاق اول: اس میں معاشرہ انتہائی سادہ اور بالکل ابتدائی حکم کا ہوتا ہے ان کی ضروریات زندگی بھی انتہائی مختصر ومحدود ہوتی ہیں اس ابتدائی دور میں اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے انبیاء آتے رہے کیونکہ اللہ کبھی بھی اپنے بندوں کی رہنمائی سے بے نیاز نہیں رہا وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيهَا نَذِيرٌ (۷۴) اور کوئی جماعت ایسی نہیں جن میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ انبیاء کی بنیادی تعلیمات ہمیشہ یکساں رہی ہیں عقائد کے بارے میں تو خاص طور پر ان کی تعلیمات کا محور ومرکز ایک ہی رہا ہے البتہ معاشرے کی اصلاح سے متعلق قواعد وضوابط باہمی تعلقات اور اجتماعی نظم کے بارے میں احکام ہر دور کے وقتی حالات اور ضروریات کے مطابق آتے رہے انبیاء نہ صرف دین کی تعلیم دیتے تھے بلکہ اجتماعی ضروریات کی تعلیم بھی دیتے تھے مثلاً تجارت وزراعت یا دیگر ضروری فنون کی تعلیم اس طرح معاشرہ کے ارتقاء میں انبیاء کی تعلیمات اور انکی ترتیب کا بہت عمل دخل رہا ہے۔

۲۔ ارتفاق دوم: جب معاشرہ پہلی منزل کی ارتقائی ضروریات کی تکمیل کر لیتا ہے تو دوسرے مرحلہ میں داخل ہوجاتا ہے جس میں انسانی اجتماع زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل بھی دی ہے اور حواس بھی یہی اسکے ذرائع علم ہیں۔ حواس سے حاصل ہونے

والے علم کو عقل کی کسوٹی پر رکھا جاتا ہے عقلی استدلال اور فکری نتائج میں بھی کیونکہ غلطی کا امکان ہوتا ہے لہذا اجتماع انسانی کے اس دوسرے مرحلے میں بھی انبیاء کی ضرورت پڑتی ہے جو فکری و عملی اعتبار سے اپنے دور اور زمانہ سے بہت آگے ہوتے ہیں۔

۳۔ارتفاق سوم: تیسری منزل تمدن کا نیا دور ہوتا ہے جس میں نئے علوم و تجربات اور منظم سیاسی نظام قائم ہوتے ہیں۔ ارتقاء کا یہ تیسرا مرحلہ اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اسکے بعد اجتماع انسانی عروج کے آخری مرحلہ میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس تیسرے دور میں انبیاء اس انداز سے تربیت کرتے ہیں کہ ایک عالمگیر اور آفاقی امت کے لیے راہ ہموار ہوسکے وہ آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی فکری اعتبار سے وحدت و آفاقیت کی دعوت دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ جن کا تعلق تیسرے دور کے اجتماع سے تھا انہوں نے اس آفاقی تمدن کی بنیاد رکھی۔

۴۔ارتفاق چہارم: حضرت ابراہیمؑ نے ایک طرف نمرودی تمدن پر ضرب لگائی جو اجتماع انسانی کی تعمیری ترقی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا اور دوسری طرف وہ اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ اجتماع انسانی کے چوتھے مرحلے کا آغاز ایک ایسے عظیم المرتبت رسول کی قیادت سے ہو جو وحی الٰہی کی روشنی میں اس آفاقی امت کی رہنمائی کرے وہ رسول ان کی اس طرح تربیت کرے کہ نئی قائم ہونے والی امت گروہوں اور نسلی فرقوں میں نبی ﷺ ہوئی انسانیت کو نجات دلا کر وحدت انسانیت کا درس دے سکے۔(۷۵) قوم کے تصور میں لسانی اشتراک کے ساتھ ساتھ تاریخی روایات اور تہذیبی یگانگت، تمام عناصر کے مقابلے میں زیادہ قوی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے آزادی کی جدوجہد میں ہندوؤں اور دوسری قوموں سے الگ ایک جداگانہ قوم ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے دعوی کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی کہ برعظیم کے مسلمان دین اسلام کے رشتے سے ایک قوم ہیں حالانکہ مختلف علاقوں سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان میں معاشرتی اور لسانی اختلافات ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں برعظیم کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کے پرچم تلے اسی نظریہ کے تحت پاکستان کی تشکیل کی اور یہ ملک خالصتاً مذہبی وحدت کی بناء پر 14 اگست 1947ء کو وجود میں آیا۔

عام طور پر قوم ایک ایسے انسانی گروہ کو کہا جاتا ہے جو طویل المدتی ارتقائی مراحل طے کر کے وجود میں آیا ہو۔ اس کے ارتقاء میں زبان، علاقہ، نسل اور معاشی و معاشرتی اشتراک کے علاوہ نفسیاتی ساخت کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ اگرچہ ایک قوم کے ارتقائی عمل میں مذکورہ تمام خصوصیات کا اہم کردار ہیں لیکن اگر کسی گروہ میں ان میں سے چند پائی جاتی ہوں تب بھی اس پر لفظ قوم کا اطلاق ہوگا۔ اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ غالب خصوصیات میں اتحاد و اتفاق ہو جزوی اختلاف کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ 'اردو قوم' کے مصنف ندیم احمد لکھتے ہیں ''میرے نزدیک ایک قوم (Nation) کی یہ تعریف عالمی معیار کے حساب سے کافی معقول اور منطقی ہے کہ قوم انسانوں کا ایک مقابلتاً بڑا مجموعہ ہوتی ہے جو صدیوں کے ارتقاء کے عمل سے گزر کر ایک ایسی اکائی بناتی ہے جس کے ارکان ایک ثقافت، ایک زبان، ایک تاریخ اور باہم خونی رشتہ رکھتے ہیں (جو کہ شادی بیاہ کے باہمی تعلق سے پیدا ہوتا ہے) بعض ماہرین اس میں مذہب اور جغرافیائی حدود کو بھی شامل کرتے ہیں۔''(۷۶)

قوم اجتماعی مفادات کے تحفظ کے احساس کے تحت وجود میں آتی ہے چونکہ ایک قومیت کا تعلق خونی رشتے سے ہوتا ہے اور

یہ حق پیدائشی ہوتا ہے اس لیے ایک شخص کا تعلق اپنی قوم سے ایسے ہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک بیٹے کا باپ سے اور اسے کسی بھی طرح سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ایک شخص اگر چاہے بھی تو اپنی قومیت چھوڑ نہیں سکتا اور دوسری قومیت کا حصہ نہیں بن سکتا۔ ایک انسان اپنا مذہب تو بدل سکتا ہے قومیت نہیں۔ مثال کے طور پر یہ ممکن ہے کہ ایک بنگالی اپنا عیسائی مذہب چھوڑ کر ہندو بن جائے۔ پھر چند دنوں کے بعد مسلمان ہو جائے، پھر بدھ مت اختیار کر لے اور اس کے بعد لا دینیت کا اسیر ہو جائے۔ یہ شخص چاہے کوئی بھی مذہب اپنا تا پھرے، اپنی بنگالی قومیت تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ بنگالی چاہے بھی تو پنجابی یا جرمن یا بہاری نہیں بن سکتا، تاوقتیکہ وہ ان میں شادی بیاہ کے رشتے کے ذریعے گھل مل نہ جائے۔ اس طرح اس کی آنے والی نسلیں مطلوبہ قومیت کا حصہ بن سکیں گی۔ ایک قوم کا ارتقاء صدیوں پر محیط ہوتا ہے یعنی یہ time dependent phenomena ہے اور شادی و بیاہ کے باہمی تعلقات کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم چار پانچ قوموں کو کسی بھی بنیاد یا نظریے پر ایک جغرافیائی حدود میں جمع کر کے راتوں رات ایک قوم کی تخلیق نہیں کر سکتے اور نہ ہی انہیں ایک قوم قرار دے سکتے ہیں ایسا سوچنا غیر منطقی اور ایسی کوشش متعلقہ انسانوں کے ساتھ تخریبی عمل ہے۔ ایک جغرافیائی حدود میں مختصر مدت میں مختلف قوموں کے اتحاد سے ہم ایک معاشرہ تو بنا سکتے ہیں مگر ایک قوم نہیں اور اسلام جب مختلف قومیتوں کو ملا کر ایک نظام زندگی کے تحت ایک جماعت بنانے کی بات کرتا ہے تو دراصل وہ ایک معاشرے کی تشکیل کی بات کر رہا ہوتا ہے۔

قوم ایک زبان اور خونی رشتے سے بنتی ہے۔ ہر قوم کا اپنا ایک تشخص، ثقافت، تاریخ اور رابطے کی زبان ہوتی ہے۔ قومیت ایک پائیدار اور مستقل بنیادوں پر قائم رہنے والی حقیقت ہے۔ قومیں نہ ایک دن میں بنتی ہیں نہ ایک دن میں بگڑتی ہیں۔ صدیوں کی مسافت اور بے پناہ توانائیاں ایک قوم کی تخلیق اور ارتقاء کے اجزائے ترکیبی میں سے ہیں۔ قوموں کے ارتقاء اور ترقی میں جغرافیائی حدود کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ سرحدیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں، ممالک وجود میں آتے ہیں اور اپنی مدت پوری کر کے بکھر جاتے ہیں۔ مگر قومیں اپنے تشخص کے ساتھ زندہ رہتی ہیں۔ دین یا مذہب اور جغرافیہ وغیرہ بیشک ایک قوم کی شکل وصورت، تشخص اور مزاج وضع کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں مگر قوموں کی تخلیق میں بنیادی اور براہ راست کردار زبان ہی ادا کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ابن منظور، جمال الدین، ابوالفضل، علامہ، لسان العرب، ج ۱۲، ص ۲۷، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع۔ دار صادر بیروت، طبع ہفتم، سن اشاعت ۱۹۹۷ئ/ ۱۴۱۷ھ

۲۔ نعمانی، عبدالرشید، محمد، مولانا، لغات القرآن، ج ۱، ص ۶۴۰، رفیق ندوی المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

۳۔ سرہندی، وارث، مولانا، قاموس مترادفات، ص ۱۴۱ تا ۱۴۳، اردو سائنس بورڈ ۲۹۹ اپر مال لاہور، طبع اول، سن اشاعت ۱۹۸۶ئ/ ۱۴۰۶ھ

۴۔ حسن اللغات (جامع) فارسی۔ اردو، ص ۶۴، علی حسن پبلشرز اورینٹل بک سوسائٹی، گنپت روڈ چوہان پرنٹنگ پریس لاہور۔ س ن۔

۵۔ نور الحسن، مولوی، مرحوم، نور اللغات، ج ۳، ص ۵۷۳، نیاز احمد پبلشرز، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، سن اشاعت ۱۹۸۹ئ/ ۱۴۰۹ھ

۶۔ لوئیس معلوف، المنجد فی اللغۃ والاعلام، ص ۱۷، المطبعۃ الکاثولیکیۃ فی بیروت، الطبعۃ الرابعۃ العشرین، سن اشاعت ۱۹۸۰ئ/ ۱۴۰۰ھ

۷۔ بلیاوی، عبدالحفیظ، مصباح اللغات، ص ۴۰، مقبول اکیڈمی ۱۹۹ سرکلر روڈ چوک انارکلی لاہور۔ س ن

۸۔ القرآن: ۴۹:۱۳

۹۔ طبری، محمد بن جریر، ابوجعفر، تفسیر طبری، ج ۲، ص ۱۹۵، دار الفکر بیروت، سن اشاعت ۱۹۷۸ئ/ ۱۳۹۸ھ ۱۰۔ حوالہ سابقہ

۱۱۔ ابن قتیبہ، عبداللہ بن مسلم، ابومحمد، تاویل مشکل القرآن، ص ۳۴۶، مکتبہ ابن قتیبہ دار احیاء الکتب العربیۃ، سن اشاعت ۱۹۵۴ئ/ ۱۳۷۳ھ

۱۲۔ ابن منظور، لسان العرب، ج ۱۲، ص ۲۷ ۱۳۔ حوالہ سابقہ

۱۴۔ القرآن: ۱۶:۱۲ ۱۵۔ راغب اصفہانی، معجم مفرداتِ الفاظ القرآن، ص ۱۹

۱۶۔ ابن قتیبہ، تاویل مشکل القرآن، ص ۴۴۵

۱۷۔ طبری، تفسیر طبری، ج ۱۲، ص ۵، دار المعرفۃ بیروت لبنان، طبع چہارم، سن اشاعت ۱۹۸۰ء/ ۱۴۰۰ھ

۱۸۔ ابن قتیبہ، تاویل مشکل القرآن، ص ۴۴۵ ۱۹۔ القرآن: ۷:۱۶۸

۲۰۔ القرآن: ۲:۶۴

۲۱۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث بن اسحاق، امام، سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، المعجم ۱۰، حدیث ۲۹۱۱، دار السلام الریاض، طبع دوم، سن اشاعت ۲۰۰۰ء/ ۱۴۲۰ھ

۲۲۔ القرآن: ۲۱:۹۲ ۲۳۔ القرآن: ۲۲:۷۸

۲۴۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید بن عبداللہ، امام، سنن ابن ماجہ، ابواب الزھد، المعجم ۳۴، حدیث ۴۲۸۶، دار السلام الریاض، طبع دوم، سن اشاعت ۲۰۰۰ء/ ۱۴۲۰ھ

۲۵۔ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، حدیث ۴۸۷ ۲۶۔ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الصلوٰۃ، حدیث ۱۹۷۸

۲۷۔ احمد بن حنبل، امام، مسند احمد، ج ۱، ص ۹۸، دار صادر بیروت ۲۸۔ ابن منظور، لسان العرب، ج ۱۲، ص ۵۰۵

۲۹۔ حوالہ سابقہ ۳۰۔ القرآن: ۴۹:۱۱

۳۱۔ راغب اصفہانی، معجم مفردات القرآن، ص ۴۳۱ ۳۲۔ لوئیس معلوف، المنجد فی اللغۃ، ص ۶۶۴

۳۳۔ سرہندی، قاموس مترادفات، ص ۸۵۷

۳۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج/ ۱۲ ایکس وی آئی، ص ۴۴۶، دی یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور، طبع اول، ۱۹۷۸ئ/ ۱۳۹۸ھ

۳۵۔ ابن منظور،لسان العرب، ج ۱۲،ص ۵۰۵
۳۶۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الفضائل المدینہ، باب ۱، حدیث ۱۸۷۰ء
۳۷۔ القرآن:۶۶:۶
۳۸۔ القرآن:۴۲:۲۲
۳۹۔ القرآن:۵۸:۵
۴۰۔ القرآن:۶۶:۶
۴۱۔ القرآن:۲۱۳:۲
۴۲۔ القرآن:۸۱:۳
۴۳۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الانبیائ، باب ۵۰، حدیث ۳۴۵۵
۴۴۔ القرآن:۱۲۴:۲
۴۵۔ القرآن:۴۶:۱۱
۴۶۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، مولانا، تفہیم القرآن، ج۱، ص ۱۶۲، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، طبع پچیس، سن اشاعت جولائی ۱۹۹۱ئ/۱۴۱۱ھ
۴۷۔ کتاب مقدس: پیدائش ۱۵:۱۸، پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور پاکستان، سن اشاعت ۲۰۰۸ء
۴۸۔ کتاب مقدس: پیدائش ۱۷:۴۔۸
۴۹۔ القرآن:۴۷:۲
۵۰۔ القرآن:۱۳۲:۲
۵۱۔ القرآن:۱۳۵:۲
۵۲۔ القرآن:۴۰:۲۴
۵۳۔ القرآن:۴۹:۳
۵۴۔ کتاب مقدس: متیٰ: ۲۴
۵۵۔ کتاب مقدس: رومیوں ۹: ۴۔۵
۵۶۔ القرآن:۸:۱۱
۵۷۔ القرآن:۳۸:۶
۵۸۔ طبری، تفسیر طبری، ج ۷، ص ۱۸۷، دارالمعرفۃ بیروت لبنان، طبع چہارم، سن اشاعت ۱۹۸۰ئ/۱۴۰۰ھ
۵۹۔ ابن منظور، جمال الدین، ابوالفضل، علامہ، لسان العرب، ج ۱۲، ص ۲۷
۶۰۔ القرآن:۱۸۴:۷
۶۱۔ القرآن:۱۱۰:۳
۶۲۔ القرآن:۱۰۴:۳
۶۳۔ القرآن:۱۲:۱۶
۶۴۔ القرآن:۲۱۴:۲۶
۶۵۔ محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا، حجۃ اللہ البالغہ، مترجم: مولانا خلیل احمد اسرائیلی، ج۱، ص ۱۱۸، اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور، سن اشاعت دسمبر ۱۹۷۷ء/۱۳۹۷ھ
۶۶۔ حوالہ سابقہ، ج ۲، ص ۱۷۲
۶۷۔ محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، ج۱، ص ۱۲۴
۶۸۔ طبری، تفسیر طبری، ج ۷، ص ۱۶۷
۶۹۔ سنگھیڑہ، نیاز احمد، پاکستان میں قوم سازی کا عمل، ص ۹، بک ہوم بک سٹریٹ ۴۶۔مزنگ روڈ لاہور، سن اشاعت ۲۰۰۸ئ/۱۴۲۸ھ
۷۰۔ القرآن:۱۲۸:۷
۷۱۔ محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، ج۱، ص ۹۳
۷۲۔ القرآن:۲:۱۲
۷۳۔ محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، ج۱، ص ۸۰ تا ۱۰۴
۷۴۔ القرآن:۲۴:۳۵
۷۵۔ محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، ج۱، ص ۱۲۲
۷۶۔ ندیم احمد، اردو قوم، ص ۱۲، ویلکم بک پورٹ کراچی، سن اشاعت اکتوبر ۲۰۰۹ئ/۱۴۲۹ھ